مرزا غالب کا نظریۂ وحدتِ انسانیت و آفاقیت

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ
گورنمنٹ آرٹس کالج۔ بنگلور

غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں اور ان کے فکر و فن دونوں نے ان کے بعد تمام نسلوں کو متاثر کیا۔ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں مغل تہذیب کی سب خوبیاں اور خرابیاں سمٹ آئی ہیں اور وہ اس کی ایک جیتی جاگتی علامت تھے جس طرف سے بھی دیکھا جائے وہ ایک طباع شاعر اور عظیم مصنف تھے۔ یہی سبب ہے کہ پرانے اور نئے نقادوں نے ان پر بہت سی کتابیں اور بہت سے مضامین لکھے اور اپنے علم و شعور کے آئینے میں ان کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی۔

مرزا غالب میں کچھ عجیب و غریب خصوصیتیں ایسی جمع ہو گئی تھیں جو بہت کم ادیبوں میں ملتی ہیں۔ ان کے ذہن کی جودت، ان میں بات میں بات پیدا کرنے کی قوت، ان کا علم اور معلومات، ان کی فراخ دلی، خودداری اور انکساری، نئی باتوں کو قبول کر لینے کی صلاحیت، دوستی کا نباہ اور محبوب میں جل جانے کا ڈھنگ — یہ سب باتیں ایسی تھیں جو ان کو عظیم اور ہر دل عزیز بناتی تھیں۔ بادشاہ سے لے کر ہرکارہ تک سب ان کو بخوبی جانتے تھے۔ ان میں جو کمزوریاں تھیں وہ ان پر پردہ نہیں ڈالتے تھے۔ شراب پیتے تھے اور مذہب کے ظاہری اعمال کا مذاق اڑاتے، مگر انسانیت کی محبت سے ان کا قلب معمور رہتا۔ وہ انسانی زندگی کے نازک پہلوؤں، ان کے ہر جذبہ و احساس اور ان کی ضروریات کو سمجھتے تھے اور اپنے کلام میں زندگی کے پیچیدہ مسائل کو ایسے خوبصورت طریقے سے پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والا یا سننے والا اسے اپنے قلب کی دھڑکنوں میں محسوس کرتا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے علاوہ ان کی دوستی انگریزوں سے بھی تھی اور ان کے کئی انگریز شاگرد بھی تھے۔ تنگ نظری ان میں نام کو نہ تھی اور وہ کسی ذات یا مذہب کے لوگوں سے تعصب نہیں برتتے تھے۔

غالب کی اکثر تصانیف دستیاب ہیں اس اعتبار سے انہیں یہ سعادت میسر ہے کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی تصنیفیں ڈھونڈ کر نکالی جا رہی ہیں اور ان کے بارے میں کتابوں پر کتابیں اور مقالے پر مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ اردو میں ان کے دیوان اور خطوط کے کئی مجموعوں کے علاوہ دو تین چھوٹی چھوٹی کتابیں ملتی ہیں۔ فارسی میں کئی مجموعے اور کئی کتابیں ہیں۔ انہوں نے اپنا اردو دیوان صرف اکیس برس کی عمر میں تیار کر لیا تھا۔ ان کی اردو شاعری کئی اسلوبوں میں ملتی ہے۔ ابتدا میں وہ فارسی سے بہت متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو میں اتنی سکت نہیں کہ وہ دقیق فلسفیانہ خیالات کو پیش کر سکے۔ انہوں نے خود کہا تھا کہ اگر کوئی میری شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہے تو وہ میری فارسی شاعری پڑھے۔ پچیس برس تک یہی رہا۔ پھر انہوں نے اپنے طرز میں تبدیلی پیدا کی اور محض تخیل سے ہٹ کر وہ زندگی کے مسائل کی طرف آئے جن کا انہوں نے واقعی تجربہ کیا تھا۔ اور انتہائی مختصر عرصہ میں قوت

تخیلہ اتنی قوی ہو گئی کہ وہ بے جوڑ چیزوں اور بے میل مسئلوں میں یکسانیت اور تعلق ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے غالب کی شاعری میں فلسفیانہ گہرائی اور زندگی کا روزانہ حسن بڑھتا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ جاگیردارانہ تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اس نظام کی اچھائیاں اور برائیاں ان میں موجود تھیں مگر ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ بدلتی دنیا دیکھ کر انہیں یقین کامل ہو چلا تھا کہ یہ وقت بدل جائے گا۔ مگر تاریخی نقطہ نظر کی کمی کے باعث وہ مستقبل کی تعمیر کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔ وہ خود زوال آمادہ تہذیب کی ایک علامت تھے۔ یہ احساس رکھنے کے باوجود مایوسی اور خوف کی گھٹا ان کے افکار اور کلام پر چھائی ہوئی ہے۔ ان کے کلام میں قنوطیت کا عنصر کم نہیں مگر وہ اس حوصلے کی تبلیغ کرتے تھے کہ زندگی سے اس کا سارا رس نچوڑ لینا چاہئے کہ زندگی اسی سے عبارت ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین غالب کی وسعت نظری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: غالب کو ایک تہذیب ورثے میں ملی تھی جسے انہوں نے اس طرح اپنایا کہ اس کا ایک کامل نہیں تو مثالی نمونہ بن گئے۔ اب یہ تہذیب ہندوستان کی سماجی تاریخ کا ایک گزرا ہوا دور معلوم ہونے لگی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ اس کی بنیاد کیسے اعلیٰ اصولوں پر تھی۔ ایک اصول تھا انسان سے محبت کرنا۔ غالب نے اس اصول کو دل سے مانا اور اس پر عمل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں

"میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔"

اسی محبت نے انہیں تہذیب کے دوسرے اصول پر عمل کرنا سکھایا۔ ان کے دل میں فیاضی اور خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو کچھ اپنے پاس ہوتا ہے سوچے بلکہ بے اختیار ضرورتمند کو دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ کوئی فقیر ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔ دوست کی مال سے مدد کرنا اپنے لئے بڑی سعادت ورزی سمجھتے تھے۔ عزیزوں کی پرورش کی ذمہ داریاں اٹھاتے رہے ان کی آرزو تھی کہ ایک عالم کے میزبان بنیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم جس شہر میں رہتے ہوں اس میں کوئی بھوکا اور ننگا دکھائی نہ دے۔ یہ تھے ان کے حوصلے حالانکہ ان کی آمدنی ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار تھی اور گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ شاید فیاضی کرنا ان کے لئے اتنا ہی لازمی تھا جتنا کہ جینے کے لئے سانس لینا۔ اور ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر اعمال اور نیت کا حساب رکھا جاتا ہے تو غالب کی فیاضی کا حساب روپیہ آنے پائی میں رکھا نہ جائے گا بلکہ یہ مانا جائے گا کہ ایک گداگر رہنے کے دل میں اس کے رب کی دولت کا عکس پڑتا تھا اور وہ اپنے حاجتمند بھائیوں کی حاجت روائی کرنے کی ایسی آرزو رکھتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اور کر نہ پایا اس کا بھی اسے ثواب ملنا چاہئے۔

یہ ان کی خیالی کی مثال تھی اب ذرا ان کے خلوص کو دیکھئے۔ اس میں ایک طرف سادگی بہت ہے جس سے انہوں نے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا تو دوسری طرف ان کی دوست داری اور اعلیٰ مرتبے میں جو انہوں نے وفاداری کو دیا۔ کون تھا جو غالب کی سی عادت چاہیے وہ عالم بڑی عالی جانے معاف نہ کر دیا جب وہ اپنے پیارے طریقے پر اس کا ذکر کرتے اور کہتے ہیں جو اس کی تیقی نہ دیا ہے گیا کہ اصل چیز دل کی صفائی ہے عیبوں کی ناپ تول نہیں۔ دوستوں سے غالب کو جو لگاؤ تھا اس کا حال ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے جس کو پڑھتے ہوئے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ کاش ہم بھی دوست رکھتے اور ان سے اسی طرح محبت کرتے۔ دراصل آدمی دوست نہ رکھتا ہو اور دوستی کا حق نہ ادا کر سکتا ہو تو اس کا کوئی مذہب کوئی دھرم نہیں ہوتا

انہی کے ہمسایہ و ہم زمانہ کے بعد سے میں ایرانی وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یہ وفاداری کس سے ہو؟ خدا سے، اصول سے یا دوست سے؟ شاید غالب کا جواب یہ ہوتا کہ کوئی مسلمان ہے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے مجھے پسند کرو۔ کوئی ہندو کہتا کہ میں ہندو ہوں اس لیے مجھے پسند کرو تو یہ میرے حق واسی لگتی میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو آدمی دوسروں کے ساتھ وفاداری اور خلوص نہ برتے وہ تسبیح اور جنیو کو خدا اور انسان کو ملانے کے لئے ایک ذریعہ بناتا ہے۔ خلوص اور دوستی کا ایک سماجی اور اخلاقی پہلو تھا جسے حق صحبت کہتے ہیں اس کا رس نکال دیا جائے تو وہ چیز باقی رہ جاتی ہے جسے ہم رواداری کہتے ہیں یہ کہا جا سکتا آسان ہو سکتی ہے۔ غالب کی نظر میں یہی اور تھا انہے مسلمان ہونے کا ~~عقیدہ~~ اس طرح پیش کرتے ہیں

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

غالب کی شخصیت جس تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اس کا تقاضہ بڑا چلاؤ تھا مگر معیار یہ تھا کہ حق صحبت ادا کیا جائے۔

مرزا غالب کے خیالوں کا دائرہ وسیع ہے وہ زمین و آسمان دونوں کی خبر رکھتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دونوں کے متعلق سوچتے ہیں وہ زمین سے نکلنے والے لالہ و گل کی ماہیت پر بھی غور کرتے ہیں اور آسمان میں چمکتے ہوئے تاروں کے حال کا راز بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں اور سارے نظریے کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان سب کے اندرونی روابط کیا ہیں۔ اس سے وہ فکری عنصر پیدا ہوتا ہے جو انسان اور کائنات کی غرض و غایت کو سمجھنے پر زور دیتا ہے۔ ہر مذہب کی حقیقت جاننے کا شوق پیدا کرتا ہے۔ دیر و حرم کلیسا و صنم کدہ، شیخ و برہمن سے دلچسپی اسی ذوق جستجو کا نتیجہ ہے۔ شاعر اور فن کار کی حیثیت سے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز فلسفیوں سے مختلف ہے لیکن اس انداز میں بھی کہ یہ جیسی بولی ہے کہ یہ دنیا کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور اس میں انسان کی کیا حیثیت ہے۔ یہ مختلف مذہبوں میں کیوں بٹا ہوا ہے۔ اگر بٹا ہوا ہے تو ان میں فرق کیا ہے؟ کیا یہ سب ایک ہی روحانی قسم کی آسودگی کی تلاش میں نہیں ہیں؟ اگر یہ سب ایک ہیں تو پھر آپس میں منافرت اور دوری کا سبب کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جنہوں نے وید اور اپنیشد، قرآن و انجیل، اور شاید ... کے ماننے والوں کو الجھائے رکھا ہے اور ان فلسفیوں کو بھی جو زندگی کے معنی اور راز تلاش کرنے کے در پے ہیں۔

مرزا غالب نے اپنی نظم و نثر میں کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اور کبھی صاف الفاظ میں کبھی محض ایک تشکیک آمیز سوال کی شکل میں اور کبھی بیمبر ان مطالب کے بیچ میں ان سوالات کو چھوا ہے۔ کوئی استدلالی بحث نہیں کی ہے۔ ان کی اردو شاعری میں دیر و حرم، کعبہ و بت خانہ، کلیسا و کنشت، کفر و دین کی علامتیں بار بار آئی ہیں لیکن ان سے ماقبل مذاہب کے اختلافات ان کی خصوصیات اور عقائدی پہلو پر زور دینا مقصود نہیں نہ کسی مذہب کو بڑا کسی کو چھوٹا کر کے دکھانا ہے۔ بلکہ ہر جگہ ان کی مدد سے اس انسانی حقیقت کو سمجھنا ہے کہ اگر سب انسان ہیں تو مذہب میں تفرقے انہیں کس طرح الگ کر سکتے ہیں یہ کہنا تو مشکل ہے کہ انہوں نے مذاہب کا مطالعہ کتنی گہرائی سے کیا تھا لیکن ان کی تحریروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ہندو مت، اسلام، زرتشتی عقائد اور صوفیانہ خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور ان میں بعض بنیادی مشترک پہلوؤں پر غور کیا تھا اور سوچ سمجھ کر اس مابعد الطبعیاتی نقطۂ نظر کو اپنایا تھا جس کو عام طور پر وحدت الوجود کہا جاتا ہے جس کی رو سے حقیقت ایک ہوتی ہے۔ اس کے مظاہر سیکڑوں خیالات کا ظاہری فرق دیر و کعبہ، کلیسا اور بت خانے کی دیواریں کھڑی کرتا ہے حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو مرزا غالب نے ایک صوفیانہ فکری مسئلہ کی شکل میں شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے۔
سر پائے خم پہ چاہئے ہنگام بے خودی رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے
یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہئے۔

اس مسئلہ کو ہم جدید سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جدید ذراتی طبعیات PARTICLE PHYSICS اور کائناتی طبعیات COSMIC PHYSIC یہ دونوں طبعیات کی دو الگ الگ شاخیں ہیں۔ پارٹیکل فزکس نے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں خصوصاً مادے کی ساخت و ہیئت FORM & STRUCTURE سے متعلق۔ ان انکشافات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مادّے کی ہیئت کچھ بھی ہو اصل حقیقت ایک ہی ہے اور اس کی اصل ہے۔ بے ہیئت FORMLESS قوت جس کو کوانٹا CUANTA بھی کہا گیا ہے اور اسے مساواتی شکل میں یوں پیش کیا جاتا ہے

$$E = Mc^2$$

یہاں E انرجی کے لئے ہے اور C سے مراد نور کی رفتار ہے۔ یہی قوت مختلف دباؤ اور تصادم اور رفتار کی وجہ سے مختلف ذرات کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ ذرات ایک دوسرے سے متصادم ہو کر کچھ اور ذرات کو جنم دیتے ہیں اور جب یہ ذرات الیکٹران، پروٹون اور نیوٹرون کی شکل اختیار کر کے بندھ جاتے ہیں تو ایٹم جنم لیتا ہے اور ایٹم کے کیمیاوی عمل سے مولی کیولز اور مالی کیولز ایک دوسرے سے مل کر مادے کی مختلف شکلوں کو جنم دیتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ کہ اصل حقیقت غیر مرئی اور غیر متشکل اور بے ہیئت ہے اور اصل وجود یہی ہے۔ یہی وجود مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے لیکن عام سطح پر ہم کسی خاص شکل اور ہیئت کو ہی سب کچھ یا آخری حقیقت مان لیتے ہیں حالانکہ یہ محض اس کا ایک ظہور ہوتا ہے۔ کسی ایک شکل یا فارم کی ہرگز پرستش نہیں کی جا سکتی اگر ہمیں حقیقت مطلق سے سروکار ہے تو اس کی ایک خاص ہیئت سے ہرگز سروکار نہیں ہونا چاہئے۔

غالب اس حقیقت کو ایک سادہ لفظوں میں جذبۂ حیرت اور سوالیہ انداز میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

یہ وہی شاعرانہ انداز ہے حقیقتِ مطلق کے بیان کا جو آنکھوں سے پرے بھی ہے اور ہر لحظہ نئی شان کے ساتھ جلوہ افروز بھی ہوتی رہتی ہے گویا یہ سب تیزی سے بدلتی ہوئی شکلیں ہیں اور تعمیر میں مضمر ہے۔ صورت خرابی کی اور اس کے برعکس بھی یعنی خرابی میں تعمیر کی صورت مضمر ہے غالب نے اسے یوں ہی کہا ہے

جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھی۔

اور یوں غالب ہم سے اور ہماری روزمرہ کی زندگی اس کی رنگا رنگی اور اس کی جدوجہد سے بھی پرے جاتے ہیں وہ فکری سطح پر اتنی بلندی پر لے جاتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان عام فرقہ بندیوں کی نفی کرتے ہیں اور ہمیں احترام انسانیت اور آزادیٔ فکر کی طرف لے جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ حقیقت کی اعلیٰ سطح پر اپنے پیر رکھتے ہوئے چھوٹی چھوٹی آرزوؤں پر بھی جان دیتے ہیں اور اس کا بھرپور شعور بھی رکھتے ہیں۔ آج ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ آزادیٔ فکر اور آرزو ہائے رنگا رنگ سے ہی صحیح معنی میں انسانی وجود مالا مال ہوتا ہے اور غالب ان دونوں باتوں پر زور دیتے ہیں اور یوں ہمارے عہد کے لئے بھی زبردست اہمیت اختیار کر جاتے ہیں

غالب مذہب کے معاملہ میں آزاد خیال تھے اور بڑے لطیف انداز میں مذاہب کے ظاہری رسوم پر طنز کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک منزل اور مرکز کا تعلق ہے اس سے غافل نہ تھے ان کے بعض اشعار اور خیالات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی جستجو کو انسان کے لئے فطری سمجھتے ہیں لیکن مذہب کو آخری منزل قرار دینے کو ٹھٹک کر رک جانا خیال کرتے تھے ان کا مشہور شعر ہے

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں۔

ان کی حسین تصویر ہے۔ انسان مسلسل تگ و دو کرتا رہے کہ تخلیق اور منشائے تخلیق کے راز دریافت کرے یہ شوق تھک کر جہاں پناہ لیتا ہے اس کا نام مذہب رکھ دیا گیا ہے اور چونکہ بار بار ایسا ہوا ہے اور ہوتا رہا ہے اس لئے دنیا میں بہت سے مذاہب وجود میں آگئے چونکہ ان کے پیچھے تلاش کا ایک ہی جذبہ کارفرما ہے اس لئے ان کے ماننے والوں میں کوئی چھوٹا بڑا فرق نہیں اصل قدر تو اس جذبے کی کرنی چاہئے جو تمام قوموں کے ساتھ اس جستجو میں سرگرداں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مومن اور کافر، مندر کے پجاری اور حرم کے پاسبان، برہمن اور شیخ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ انہیں عقیدتوں سے کام لیکر غالب نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مذاہب کے درمیان رواداری جذباتی ہم آہنگی اور اتحادِ باہمی کا منشور بن سکتا ہے۔ کہتے ہیں ع

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

اگر کسی شخص نے عیسائی اور ایک پارسی سے ایک مذہب اختیار کیا اور دوسرے نے کوئی تو اس میں جھگڑے کی بات کیا ہے۔ دونوں سچے ہیں دونوں کو ایک ہی برتاؤ کا مستحق قرار دیا جانا چاہئے مسجد اور مندر، قبرستان اور شمشان کے لئے لڑ کر جان دینے والے اگر مذہب کے فرق کو اس نظر سے دیکھیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ آج کی دنیا میں ہمارا سماج کثیر المذاہب اور کثیر اللسان سماج ہے اور ایسے سماج میں ہر مذہبی گروہ یا ہر نسلی اور لسانی گروہ اپنے اپنے تشخص پر زور دیتا ہے اور اکثر یہ زور تصادم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس تناؤ اور تصادم کو اسی صورت میں ختم کیا جا سکتا ہے جب ہم فلسفیانہ سطح پر ان علاحدہ تشخصات پر اصرار نہ کریں اور پوری انسانیت کی وحدت کو تسلیم کریں۔ ہندوستان میں بھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے غالب کا ذہنی رویہ جو انھوں نے اپنایا تھا بڑی معنویت اور اہمیت کا حامل ہے۔ آج ہمیں اس رویے کو اختیار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ دراصل قرآن حمید نے بھی گروہ بندی اور حزبیت SECTARANISM کی مذمت ان الفاظ میں کی ہے

فتقطعوا امرهم بينهم زبرا كل حزب بما لديهم فرحون ۲۳: ۵۳

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنائے ہر ٹولی کے پاس جو کچھ آ گیا ہے اس میں خوش ہے۔ دراصل انسانیت کا احترام اسی میں ہے کہ حزبیت کی مذمت کی جائے اور انسان کو اس سے نجات دلائی جائے۔

غالب کی فکری جہت اور ہمارے عہد میں اس کی معنویت کا بڑا ہی اہم پہلو ان کی توحید پرستی، ان کا موحد ہونا اور وحدت الوجود کے نظریے کی حمایت کرنا۔ غالب اپنے آپ کو بڑے فخر سے موحد کہتے ہیں اور ترک رسوم اور ملتوں کے مٹ جانے کو اپنے ایمان کے اجزاء قرار دیتے ہیں۔ دراصل توحید اب محض ایک درسی الٰہیات (THEOLOGY) کا عقیدہ اور وہ بھی محض عقیدہ بن کر رہ گیا ہے اور اس کی انقلابی قوت اس رسمی عقیدہ میں گم ہو کر رہ گئی ہے

اصل میں توحید کا تصور قبل اسلام عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی اور اسلام کے وجود میں آنے کے وقت بھی سماجی اعتبار سے تمام سماجی اور معاشی امتیازات کو ختم کرنے والا تصور تھا۔ ایک خدا کی عبادت کا مطلب ہوتا ہے تمام عبادت کرنے والوں کی خدا کی نظر میں برابری۔ نہ الگ الگ دیوتا نہ الگ الگ مندر نہ الگ الگ مسلک نہ الگ الگ ملتیں اس طرح سماجی اعتبار سے یہ انسانی وحدت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ اس طرح صحیح معنی میں وحدت قائم کرنے کے لئے معاشی نشیب و فراز کو ختم کرنا بھی ضروری ہے اور یوں توحید کا تصور الٰہیات کی سطح سے سماجی سطح پر آ کر سماجی انصاف اور عدم استحصال کا بھی پیامبر بن جاتا ہے۔ یہ تصور تمام موجودات کی وحدت کا قائل ہے اور یوں یہ وحدت کرۂ ارض تک محدود نہ رہتے ہوئے کائناتی وحدت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس تصور کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہر شئے میں جلوہ افروز ہے اور ہر شئے میں یوں سمائی ہوئی ہے جیسے تار میں برقی رو۔ حقیقت مطلق ماورائی TRASCENDENTAL نہیں محیط کل اور خلقی IMMANENT تصور کی جاتی ہے۔ یہ تصور دراصل کائناتی وحدت کا علمبردار

ہے۔ اساسی نسل، لسانی، تہذیبی اور فرقہ وارانہ اختلافات اور امتیازات کی کوئی گنجائش نہیں اور اس میں وہی حقیقت مطلق متجلی ہوتی ہے اور صحیح معنی میں موحّد وہی ہو سکتا ہے جو ان مصنوعی امتیازات کی مکمل نفی کرے اور ان کی تمام علامتوں تک کو مٹا دے یہی بات غالب اپنے شعر میں کہہ رہے ہیں۔ ؎ [1]

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مرزا غالب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اصل چیز کسی مذہب میں پیدا ہونا نہیں بلکہ اس کو پہچان کر اس سے وفاداری برتنا ہے۔ عزت اسی کی ہوتی ہے جو مذہب کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتا ہے اور کسی لالچ کے بغیر یا کسی قسم کے ڈر سے اس کے قدم ڈگمگا نہیں جاتے۔

کوئی شخص ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لئے ہو یا ہر وقت جنیؤ میں لپٹا ہوا ہو تو وہ اس سے پاکباز اور ایماندار نہیں ہو جاتا یہ دونوں عمل ظاہری ہیں نہ تسبیح والا شیخ، شیخ ہے نہ جنیؤ والا برہمن، برہمن۔ شیخ و برہمن کی سچائی کا امتحان اس وقت ہوگا جب انہیں اپنے عمل میں تیقن کی جھلک بھی نظر آئے اس ڈر سے عبادت کرنا کہ اگر اس میں کمی واقع ہوگئی تو جہنم میں پھینک دیا جائے گا یا اس لالچ میں نمازیں پڑھنا کہ خدا خوش ہوگا اور جنت بخش دے گا عبادت کی روح کے منافی ہے۔ یہ عبادت ڈر اور لالچ کی پیداوار ہے ان سے بچ کر جو عبادت کر سکے وہ قابلِ عزت ہے۔ مرزا غالب نے ایک شعر میں اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

جس شخص کا یہ عقیدہ ہو وہ جنت اور جہنم کو غیر اہم قرار نہ دے تو کیا کرے کیونکہ یہی عبادت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ غالب نے شاعرانہ انداز میں ان پر طرح طرح سے طنز کیا ہے جو انہیں ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ایک جگہ کہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یا رب　سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

بنیادی طور پر یہ ساری باتیں اس ایک خیال کا جز ہیں کہ مذہب کی روح جنت اور دوزخ، کعبہ اور زمزم اور جامۂ احرام کی اہمیت پر زور دینے سے کم نہیں ہوتی کیونکہ یہ ساری چیزیں ظاہر پرستی سے تعلق رکھتی ہیں اور مذہب کی مخصوص رسمیں علامتیں ہیں چند اشعار سے یہ نقطۂ نظر واضح ہو جائے گا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم　دھوئے دھبے جامۂ احرام کے۔

---

[1] مجلہ جدید میں غالب کی معنویت۔ از اصغر علی انجینئر ص ۱۰۶ تا ص ۱۱۴ ماخوذ غالب نامہ جلد ۸ نمبر ۲ جولائی ۸۷

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

جو لوگ غالب کے طرزِ فکر اور اندازِ بیان سے واقف ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ اشعار محض شگفتہ مزاجی، رندمشربی یا اظہارِ آزادی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے پیچھے انسانیت پرستی کا ایک عظیم الشان تصور کام کر رہا ہے۔ یہ تصور تعصب، فرقہ پرستی، تنگ نظری، نسلی افتراق، قومی اختلاف اور انسان دشمنی کے جذبات پر کاری ضرب لگاتا ہے اور جب غالب جیسے فنکار کے نغموں میں ڈھل کر سامنے آتا ہے تو زمین و آسمان کی حدیں مل جاتی ہیں اور ان سے وحدت اور آفاقیت کے سُر نکلتے ہیں[۱]

غالب کی خصوصیات میں حقیقت پسندی، طرزِ ادا کا حسن، تازگی، فلسفیانہ عمق، جذباتی احساس اور جدّت سب اس طرح سے مخلوط ہیں کہ کوئی دوسرا شاعر ان کے برابر نہیں لایا جا سکتا۔ غالب کی آرزومندی انہیں جدت پسند بناتی ہے۔ ان کی آرزومندی کا مرکز انسانی وجود ہے اسی لئے وہ جدّت اور تبدیلی کی طرف مائل ہے۔ یہ جدت پسندی بڑی تخریب کار ہے اور اسی لئے اس کی معنویت بڑھ جاتی ہے اور جتنی بڑھ جاتی ہے اتنا ہی نہیں ان کی تبدیلی اور جدّت پسندی معمولی قسم کی نہیں برق رفتار ہے۔

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

گویا ان کی زندگی کا کیلنڈر آفتاب نہیں برق طے کرتی ہے۔ تبدیلی کی آفتاب رفتاری انہیں مطمئن نہیں کرتی۔ ان کی طبیعت تو برق رفتار تبدیلی کی طرف مائل ہے۔ وہ اپنے آپ کو "آتش بجاں" قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کون میرے پاس ٹھہر سکتا ہے

پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

ہمارا عہد برق رفتار تبدیلیوں کا عہد ہے۔ اس عہد میں جس تیز رفتاری سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں فکری اور نظری تبدیلیاں بھی اور ٹکنالوجی کی تبدیلیاں بھی وہ آج تک کسی اور عہد کا خاصہ نہیں رہا۔ ہمارے عہد میں آئنسٹائن نے نظریۂ اضافیت کی بنیاد ڈالی جس کی بنیاد بھی برق کی رفتار ہے۔ ذراتی طبعیات PARTICLE PHYSICS میں بھی اور COSMIC PHYSICS میں بھی آج تمام نظریوں کی بنیاد برق کی رفتار یعنی لو پر ہے[۲]

یہ صحیح ہے کہ غالب کی شاعری کوئی فلسفیانہ آدرش نہیں پیش کرتی مگر زندگی کی قوت، عظمت اور حسن کے گیت گا کر زندگی سے محبت کرنا ضرور سکھاتی ہے اس لئے جو شخص زندگی کی گہرائیوں کو سمجھنا اور ان میں داخل ہونا چاہے تو اسے غالب کی شاعری میں بہت کچھ ملے گا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

۱؎ غالب کے نغموں میں وحدتِ انسانی اور آفاقیت کے رنگ۔ پروفیسر احتشام حسین۔ ماخوذ غالب نمبر ص ۱۶ تا ص ۲۳

۲؎ عہدِ جدید میں غالب کی معنویت از اصغر علی انجینئر۔ ص ۱۱۱

غالب کو انیسویں صدی کے نمائندہ شاعر کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعرا نے بھی زندگی کے دکھوں کا بیان کیا ہے جو ایک ٹوٹتی ہوئی تہذیب عطا کرتی ہے۔ مگر ان کے احساس کے معیار اور غالب کے فنکارانہ احساس میں بڑا فرق ہے جو اُن کی پوری شاعری پر پھیلا ہوا ہے۔

جن عناصر کی بنا پر غالب کا وہ کلام جو ایک عرصے تک اردو کے تنقیدی مزاج اور ہمارے ادبی مذاق سے ہم آہنگ نہ ہو سکا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ غالب نے نامانوس، خلافِ محاورہ اور فارسی نما اردو میں پیچ در پیچ استعاروں کے ذریعے عجیب مضامین باندھے اور ایسے انوکھے شعری پیکر خلق کئے تھے جن کا ہماری مانوس دنیا کی حقیقتوں سے بظاہر کوئی تعلق نہ تھا اور اسی وجہ سے ان شعروں کو مشکل اور مبہم ہی نہیں مہمل کہہ کر بھی مسترد کیا جاتا تھا۔

لیکن عہدِ جدید میں یہی کلام غالب کی مقبولیت کا تازہ سبب بنا اور جن عناصر کی بنا پر ابھی تک لائقِ اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا انہیں عناصر نے اسے جدید ذہن کے لئے سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور قابلِ قبول ٹھہرایا۔ اس انقلاب کا سبب اردو ادب میں جدیدیت کا فروغ اور اس سے وابستہ تنقیدی نظریات ہیں۔ ان نظریات کے تحت شعر میں اظہار و ابلاغ کے مسائل خاص طور پر زیرِ بحث آئے اور جدید نقادوں نے جن امور پر زیادہ زور دیا وہ مختصراً یہ ہیں۔

ضروری نہیں کہ شعر کے جو معنی شاعر کے ذہن میں ہوں وہی قاری سمجھے۔ مکمل ابلاغ یعنی بات کو اس طرح کھول کر بیان کرنا کہ وہ فوری اور پوری کی پوری واضح ہو جائے شعر کی خوبی نہیں۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اسے سمجھنے کے بعد بھی اس میں کچھ مفاہیم باقی رہ جائیں۔ ابہام شعر کا عیب نہیں حسن ہے۔ مبہم شعر ٹھیک سے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اچھا معلوم ہو سکتا ہے اور مختلف النوع تاثر پیدا کر سکتا ہے۔ شعر کی زبان کو زیادہ سے زیادہ غیر رسمی اور نثر کی زبان سے زیادہ سے زیادہ دور ہونا چاہئے۔ بالواسطہ، استعاراتی اور علامتی پیرایہ شعر کا بہترین پیرایہ ہے۔ یہ سارے تنقیدی خیالات غالب کے مشکل کلام کا جواز فراہم کر رہے ہیں ان کا اصل مقصد جدید شاعری کا جواز فراہم اور ان الزاموں کا رفع کرنا تھا جو شروع میں جدید شاعروں پر بہ کثرت وارد ہوئے۔ جدید شاعروں کو بھی انہیں اعتراضوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے غالب دوچار ہوئے تھے۔

اس طرح فطری طور پر غالب جدید شاعروں اور نقادوں کے مزاج کے قریب آ گئے اور ان کی اس استمراری مقبولیت نے عہدِ جدید میں اپنے لئے تازہ اسباب پیدا کر لئے۔ جدید ذہن ان مشکل شعروں کو قبول کرتا اور لائقِ تحسین جانتا ہے۔ اگرچہ اسے ان مفاہیم کے روشن نہ ہونے کا اعتراف ہے۔ اس کے علاوہ نسبتاً صاف اور سہل اشعار نے بھی عہدِ جدید کے سیاق و سباق میں نئی معنویت پیدا کر دی اور مجموعی حیثیت سے بھی نیا عہد دوسرے تمام کلاسیکی شاعروں سے زیادہ غالب کو اپنے ذہن کے قریب پاتا ہے اور غالب کو جدید ذہن کا مالک جانتا ہے۔ اس لئے کہ تفکر اور تشکیک و ناآسودگی کے احساس کی وہ صورتیں جو عہدِ جدید کا خاصہ ہیں غالب کے یہاں مل جاتی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں

"اردو کے تمام بڑے شاعروں میں غالب سے زیادہ کائناتی اور ذاتی المیے کا احساس کسی کو نہیں تھا! اور بیسویں صدی کے ذہن کی جیسی پیش آمد ANTICIPATION غالب کے یہاں ملتی ہے ویسی بیسویں صدی کے بھی بہت سے شعراء کو نصیب نہیں ہوئی۔"

اس سلسلے میں دوسرے جدید نقاد بھی فاروقی کے ہم نوا ہیں۔ غالب کے ایسے شعر عہد جدید کے ادبی پیش منظر پر روشن ہوئے ہیں جن کو اس سے قبل زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا تھا۔ مثلاً

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب　　ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا　　واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

غالب اور اقبال میں جدیدیت کے نقطۂ نظر سے بھی اہم فرق ہے۔ اقبال کا بنیادی طور پر کمٹمنٹ commitment اسلام سے ہے جبکہ غالب اس اعتبار سے زیادہ سیکولر ہیں۔ اقبال کا طرۂ امتیاز Islamic humanism سے ہے تو غالب کا Secular Humanism سے۔ ہندوستان جیسے سماج میں اور عہد جدید کے ہندوستانی سماج میں جو بنیادی طور پر کثیر المذاہب Multi Religious سماج ہے غالب کا نقطۂ نظر زیادہ معنویت اور اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کا اپنا رنگین ہے مزاج کا بھی اور فکر کا بھی وہ نہ مذہب سے بیزار ہیں اور نہ سیکولرزم کے مخالف وہ دونوں میں توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنی راہ تلاش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی غالب کے فکر و نظر کی معنویت ہمارے عہد کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اگر مخالفت کرتے ہیں تو احیاء پرستی کی۔ کیونکہ اس کی اپنی ایک خاص سمت ہے اور اس کے اپنے مقاصد بھی۔ احیاء پرست سارے سماج کو ایک ہی مذہب کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اور ایک ہی تہذیب کو سارے ملک کی تہذیب قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ ناممکن سی بات ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا کے ذرائع نقل و حمل کے پیش نظر دنیا کا کوئی ملک یک نسلی، یک لسانی اور ایک مذہبی نہیں رہ سکتا۔ ہر ملک میں آج مختلف نسل اور مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں۔ آج کے کثیر المذاہب اور کثیر اللسان سماج میں احیاء پرستی کا رویہ بقاء امن کے لئے ہرگز ہرگز معاون نہیں ہو سکتا ایسے میں سیکولر نقطۂ نظر ہی زیادہ رواداری کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا طرز فکر آج کے دور میں ہمارے لئے زیادہ اہم بن جاتا ہے۔ اپنے دور کے متعلقہ مسائل سے نمٹنے کے لئے جدید طرز فکر کی اپنی اہمیت ہوتی ہے مذہب کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو وہ انسان کو روحانی قدروں کی طرف لے جاتا ہے تنگ نظری کی طرف نہیں۔ غالب مذہب کو اس معنی میں قبول کرتے ہیں اور جدید طرز فکر کا بھی استقبال کرتے ہیں کیونکہ تصادم مذہب اور جدید طرز فکر میں نہیں ہوتا تصادم ایک کلچر اور دوسرے کلچر میں ہوتا ہے۔

نئی صورتحال کے لحاظ سے عہد جدید میں غالب نے بیرون ملک بھی ذہنوں کو متاثر کیا اس کے اسباب غالب کی شخصیت اور شاعری کی طرح مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد بھی ہیں مثلاً جب روسی نقاد غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں سماجی شعور، عوام دوستی اور سامراج دشمنی میں اپنے معاصروں سے آگے پاتے ہیں۔ جدید امریکی شاعرہ ایڈرین رچ کو جب غالب کی کچھ غزلوں کے انگریزی تراجم دیے گئے تو اسے ان غزلوں میں خیال کے ارتکاز اور ہمہ گیری کی بہ یک وقت موجودگی نے حیران کر دیا اس نے ان اشعار کے مضامین انگریزی میں نظم کیا اور اعتراف کیا کہ غالب کے شعروں کو انگریزی نظم کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسے ایسے واضح نقوش اور پیدا کرنا ترک کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جن کے پیچھے پیچیدگیوں، بازگشتوں اور عکس در عکس کا ایک سلسلہ موجود ہے اور ان نظموں کا اجمال اور چستی سے بالکل مختلف محسوس ہو۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد جدید میں غالب کی مقبولیت نے اپنے لیے نئے میدان دریافت کر لیے ہیں اور آئندہ زمانوں میں بھی غالب کا انتظار کر رہی ہے۔